الطاف جاوید

جدید اسلامی ریاست

اکیسویں صدی کے تناظر میں

۵ / اپریل ۱۹۹۵ء کو ادارہ ثقافت اسلامیہ اور مجلس یادگار خلیفہ عبدالحکیم نے مرحوم ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی برسی پر قائداعظم لائبریری میں ایک لیکچر کا اہتمام کیا تھا۔ جناب الطاف جاوید نے اپنے لیکچر میں اکیسویں صدی کے تناظر میں مسلم جماعت سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنے عظیم روحانی سرمایہ سے سرشار ہو کر دکھی انسانیت کی نجات کے لیے کام کرے، کیونکہ زندگی کے مادی فلسفہ حیات نے انسان کو کچھ نہیں دیا۔ (ادارہ)

☆ ☆ ☆

اسلام فرد کو خاندان یا معاشرے کے رکن کی حیثیت سے دیکھتا ہے اور معاشرے کی سب سے اعلیٰ تنظیم ریاست ہے۔ ایک فرد، خاندان، معاشرہ اور ریاست سے الگ رہ کر نہ تو اپنی ذات کی تکمیل کر سکتا ہے اور نہ مادی ضروریات حاصل کر سکتا ہے، اس لیے اسلام افلاطون اور ارسطو سے اس بات میں متفق ہے کہ ایک عادل ریاست کا قیام اجتماعی عدل اور فرد کی خوش حال زندگی اور تکمیل ذات کے لیے ناگزیر شرط ہے۔ (۱)

چونکہ ریاست معاشرے کی سب سے اعلیٰ تنظیم ہے اس لیے اس کی اہمیت یہ ہے کہ یہ حیات انسانی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہوتی ہے۔ جامعہ ملیہ کے پروفیسر مجیب نے اپنی "تاریخ فلسفہ سیاسیات" میں ریاست کی تعریف میں کہا ہے کہ "ریاست میں اصل چیز افراد کا متحد اور منظم ارادہ ہے' خواہ ان کی غرض کچھ بھی ہو اور ریاست کا نظام خواہ کوئی بھی شکل اختیار کرے۔" ریاست میں منظم رہنے کا ارادہ ایک خاص نظام حکومت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ریاست اور معاشرے میں فرق یہ ہے کہ معاشرہ ایک ایسی جماعت کو بھی کہہ سکتے ہیں جو غیر منظم ہو یا جس میں حاکم و محکوم کا رشتہ مبہم ہو' جیسے خانہ بدوش قبیلے۔

خلیفہ عبدالحکیم کہتے ہیں کہ "یہ مسئلہ کہ مذہب کس طرح زندگی میں تخلیقی تحریک پیدا کرتا ہے' اس کو ترقی دیتا اور سنوارتا ہے' قدرتاً" اس سوال سے مربوط ہو جاتا ہے کہ زندگی کو معاشرے کی اعلیٰ ترین تنظیم یعنی مملکت سے کس طرح کا تعلق رکھنا ہے..... ہر واقعی مملکت اسی نصب العین کی صورت پذیری کرتی ہے جس کو وہ ممکن العمل سمجھتی ہے اور اس کی تمام سیاسی اور تہذیبی ساخت اور اس کے آئین کی نوعیت اس نصب العین پر منحصر ہوتی ہے۔ مملکت کے شہریوں اور ما بقی انسانیت کی زندگی کے لیے یہ معاملہ نہایت اہمیت رکھتا ہے کہ اس نصب العین کی تعریف و تعیین کی جائے جو اس کی زندگی میں تخلیقی تحریک پیدا کرتا اور خوش حالی کے تصور کو عملی صورت دیتا ہے جس کو کہ وہ حاصل کرنا چاہتی ہے۔"ہ۔ (۲)

خلیفہ صاحب مزید لکھتے ہیں:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک فرد کی ذات یا خودی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ معاشرے میں زندہ رہتی' حرکت کرتی اور اپنا وجود رکھتی ہے۔ معاشرہ خود آگاہی کی تخلیق کرتا اور اسے پروان چڑھاتا ہے۔ اعلیٰ اخلاق کی تعلیم تو تمام بڑے مذاہب نے دی ہے مگر کسی مذہب نے اسلام سے قبل آغاز سے ہی یہ کوشش نہیں کی' یا وہ کامیاب نہیں ہوسکا کہ ایک (فلاحی) ریاست کی صورت میں معاشرے کی

تنظیم کرے۔" (۳)

چنانچہ اسلام سے پہلے کی تاریخ بتاتی ہے کہ انبیا اور حکما میں سے چند ایک ریاست کی سربراہی کرسکے جو انھیں ورثے میں ملی تھی' جب کہ ان مقدس رہنماؤں کی اکثریت اپنے نظریہ حیات اور نصب العین پر ریاست کا قیام عمل میں نہیں لاسکی۔ عام طور پر بانی مذہب کی ساری زندگی ریاست قائم کرنے کی جدوجہد میں گزری ہے۔ حضرت ابراہیمؑ' حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر ریاست قائم نہ کرسکے۔ حضرت سلیمان ایک ریاست کے سربراہ تھے۔ اسی طرح آریائی اقوام میں سوائے رام چندر اور کرشن مہاراج کے جو چھوٹی سی ریاستوں کے مالک تھے' سقراط' زرتشت' مہاتما بدھ اور مہاویرا بھی ریاست قائم نہ کرسکے۔ اور زرد اقوام کا مصلح اعظم کنفوشس بھی اچھی حکومت کے قیام کے لیے وعظ ہی کہتا رہا لیکن ریاست قائم نہ کرسکا۔

اس تاریخی پس منظر میں صرف محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہی ایسی ہے جو نظریے کی تدوین' اس نظریے پر پارٹی کے قیام اور معاشرے کو تبدیل کرنے کے لیے اپنے نصب العین پر ایک جدید اخلاقی و انقلابی ریاست تعمیر کرنے میں کامیاب ہوگئی اور اس سارے عمل میں آنحضرتؐ کی ذات گرامی خود شریک رہی' اور پھر ریاست کی بنیادوں کو مضبوط کرنے اور پورے عرب کو اس کے زیر سایہ لانے میں کامیاب ہوگئی۔ افراد کی سیرت کی تشکیل معاشرے اور ریاست سے باہر ممکن نہیں' شاید اس لیے حکمت الٰہی نے ریاست کی تشکیل میں آپؐ کی مدد فرمائی۔

آپؐ کو نہ صرف ریاست کے قیام میں کامیابی حاصل ہوئی بلکہ بہبود انسانیت کے لیے ریاست کے بنیادی اداروں یعنی مقننہ' انتظامیہ اور عدلیہ کی رہنمائی کے لیے ایک ایسی کتاب مقدس عطا کی گئی جس کی تعلیمات بنیادی طور پر نہ صرف عالم گیر ہیں بلکہ آنے والے ہر زمانے کے جدید معاشرے کی جدید ضروریات

کو پورا کرنے کے اپنے اندر امکانات بھی رکھتی ہیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر ڈاکٹر فضل الرحمان نے فہم قرآن کے سلسلے میں بتایا ہے کہ "قرآنی تعلیمات و ہدایات کی آفاقیت کی مثال برف کے ایک تودے کی سی ہے جس کا ایک حصہ تو نظر آتا ہے مگر اس کے نو حصے پانی میں ڈوبے ہوتے ہیں۔ اس لیے قرآن حکیم کے معانی تہوں (Layers) کی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں اور معانی کی یہ تہیں معاشرتی ارتقا کے ساتھ ساتھ ہر مرحلے کی نئی ضروریات کی تکمیل کے لیے غور و تدبر سے سامنے آتی رہیں گی۔" (۴)

خلیفہ عبدالحکیم نے بتایا ہے کہ "افلاطون نے اپنی "جمہوریت" میں کہا ہے کہ "ہم ناممکن چیزوں کے متعلق گفتگو نہیں کرتے' تاہم اقرار کرتے ہیں کہ یہ چیزیں دشوار ہیں مگر یہ محض خواب و خیال نہیں ہیں' اگر سلطان فلسفی ہوتے یا فلسفی سلطان ہوتے تو یہ واقعیت کا رنگ اختیار کر لیتیں۔ سقراط اور افلاطون اپنے مثالی انسان کو فلسفی کہتے ہیں جب کہ دوسرے مذاہب میں اسے نبی یا اوتار کہا جاتا ہے' اور رواقی اسے حکیم کہتے ہیں۔ اور اس انسان کامل میں تمام تہذیبی اقدار کاملاً" منشکل ہوتی ہیں' یہ انسان کامل محض منطقی' قیاسی اور خیال پرست نہیں ہے بلکہ اپنے نصب العین کو حقیقت کا رنگ دینے والا ہے' اس لیے افلاطون کی سلطان سے مراد مطلق العنان حکمران نہیں جو طاقت کو اپنے شخصی حوصلوں کی تکمیل میں استعمال کرتے ہیں بلکہ یہ اعتدال پسند حکمران ہیں جو اپنے آزادانہ اختیار کے ساتھ انصاف کے نصب العین کو حاصل کرتے ہیں۔ یہ لوگ اعلیٰ ذہانت کے مالک' میدان عمل کے شہسوار اور بے داغ کردار کے حامل ہوتے ہیں۔ (۵)

"یہ بات اب تاریخی حقیقت بن چکی ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے علاوہ دنیا کے عظیم روحانی رہنماؤں میں سے کسی نے بھی ایک مثالی مملکت کے حصول کی کوشش نہیں کی یا کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ یہ آپؐ ہی کی وہ ذات گرامی ہے جس کا خواب افلاطون نے دیکھا تھا اور ایسی ریاست زمین پر قائم کر دی جسے حضرت مسیحؑ

نے "خدا کی بادشاہت" کہا تھا۔ (۶)

خلیفہ صاحب کہتے ہیں کہ "افلاطون اور آنحضرتؐ میں ایک فرق یہ تھا کہ آنحضرتؐ کے پیش نظر پوری انسانیت بحیثیت ایک جز کے تھی جس میں ایک ذات واحد بہ صورت کثرت جلوہ گر تھی۔ آنحضرتؐ مکہ اور مدینہ کی شہری ریاستوں کے قیام پر مطمئن نہ تھے اور نہ آپؐ اس بات پر مطمئن تھے کہ جزیرہ نمائے عرب آپؐ کے زیر فرمان آگیا ہے..... چنانچہ آپؐ نے جونہی اپنے وطن میں خود کو محفوظ پایا تو گردوپیش کی سلطنتوں کے حکمرانوں کے نام دعوت نامے جاری فرما دیے' جن میں اپنی اطاعت یا عرب کے اقتدار کو تسلیم کرنے کا مطالبہ نہ تھا بلکہ اس نصب العین کو ماننے کی دعوت دی گئی تھی جو مختلف نسلوں اور مذہبوں کو باہم متحد کرتا تھا۔ وہ نصب العین تمام حقیقتوں کی وحدت تھی جن کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے۔ یہ اس دعوت کے مماثل تھی جو عیسائیوں اور یہودیوں کو دی گئی تھی کہ وہ ایسی چیز پر متحد ہو جائیں جو ان کے درمیان مشترک اساس ہوسکتی ہے اور جو اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ ایک خدا کی پرستش کو حقیقت کا رنگ دیا جائے جو حق و انصاف کی علامت ہے۔ اسلام نیکی یا خیر کو تمام انسانیت کا ورثہ تصور کرتا ہے اور اسے معروف کی اصطلاح سے موسوم کرتا ہے۔" (۷)

اسلام چونکہ آخری دین تھا اس لیے اس کی دعوت اور انقلاب دونوں عالمگیر حیثیت رکھتے ہیں۔ خلیفہ صاحب کہتے ہیں کہ "قرآن جملہ خدا پرست مذاہب کی تصدیق کرتا ہے۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ انبیائے سابقین سے لے کر آنحضرتؐ تک اصول دین میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ حضرت ابراہیمؑ' حضرت موسیٰؑ' حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ تمام نامعلوم اور فراموش شدہ پیغمبر جنھوں نے خالق کائنات کی وحدانیت کا اعلان کیا سب ایک ہی برادری کے افراد تھے۔ رسوم و عادات' طریقہ ہائے عبادت و رواج' معاشی اور معاشرتی سانچے سب حالات کے تحت تبدیل ہوتے رہے اور دین کی اصل حقیقت ان مختلف صورتوں

میں اپنا ظہور کرتی رہی۔" (۸)

"اس لیے اسلام محض خدا پر ایمان لانا' اپنی روح کی حفاظت کے لیے عبادت کرنا اور دنیا کی آلودگیوں سے اجتناب کرنا ہی نہیں بلکہ اس کا اولین مقصد زندگی کے تمام ضروری پہلوؤں پر عملاً اور کاملاً" نظر رکھ کر زندگی کو بہتر بنانا ہے۔" (۹)

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ خلیفہ صاحب نے اس نئی ریاست کے لیے "اشتراکی جمہوریت" (Socialist Democracy) کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ خلیفہ صاحب فرماتے ہیں کہ "آپؐ نے مزدوروں' کسانوں اور گلہ بانوں کی مملکت کی داغ بیل ڈالی' لیکن اس میں متدین تاجروں اور طالبان علم کو بھی محنت کرنے والوں میں شامل فرمایا۔ جس چیز کی آپؐ نے حوصلہ افزائی نہیں فرمائی وہ طفیلیت اور بغیر کمائی ہوئی آمدنی پر گزر بسر کرنا تھا۔ آپؐ نے سرمایہ پر محصول عائد کیا اور کلانیت یعنی خلف اکبر کی وراثت کے قانون کو برخاست کر دیا جس کی رو سے مولود اکبر پوری جائیداد کا بلا شریک و سہیم وارث ہوتا تھا اور اس کے چھوٹے بھائی بہن اور دیگر رشتہ دار محروم رہتے تھے۔ آپؐ نے زمین کاشت کرنے والے کو زمین کا مالک تصور کیا۔" (۱۰)

خلیفہ صاحب نے اسلامی ریاست کو غیر طبقاتی معاشرہ کہا ہے اور لکھا ہے:

After all the wealth and comports of the rich are the products of the labours of the poor.(11)

اقبال نے اپنے ایک خط بنام نہرو میں لکھا تھا کہ اسلام کو اشتراکیت سے کوئی خطرہ نہیں کیونکہ اسلام خود ایک قسم کی اشتراکیت ہے۔ اقبال نے اپنے اشعار میں ملت برطانیہ یا ملت امریکہ کو مخاطب نہیں کیا بلکہ ملت روسیہ کو نصیحت کی ہے کہ وہ تاج و تخت اور مذہبی پیشوائیت کے مسخ شدہ مذہب کو ختم کرنے کے بعد خود

ہی ہم مسلمانوں کی طرح دوبارہ اس دلدل میں نہ پھنس جائے۔ (جاوید نامہ)

ترکی کی معروف دانشور خاتون خالدہ ادیب خانم نے اپنی کتاب "India IN Side" میں لکھا ہے کہ جب اس سے ایک مسلم سیاست دان نے دریافت کیا کہ اس عہد میں مسلمان کو کس چیز کی ضرورت ہے تو اس نے جواب دیا کہ ایک مسلمان کارل مارکس کی۔"

جہاں تک جمہوریت کا تعلق ہے تو چونکہ اسلامی جمہوریت روحانی اخلاقی ریاست ہے' اس لیے اس کی پارلیمنٹ میں جاگیرداروں' صنعتی سرمایہ داروں' سمگلروں اور ڈرگ مافیا کے نمائندوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے' جیسا کہ خلیفہ صاحب نے فرمایا ہے۔ "کوئی جمہوریت جو اسلامی ہونے کی دعوے دار ہو' وہ نہ برطانوی نمونے کی ہوگی اور نہ روسی' ان میں پہلی تو دو یا زائد جماعتوں کے تصادم پر مبنی ہے اور دوسری صرف ایک جماعت کے اقتدار کی اجارہ داری ہے جو کسی اختلاف کو برداشت نہیں کرسکتی۔ اگر کوئی اسلامی حکومت اسلامی اصول پر اسمبلی یا کسی پارلیمنٹ کی تشکیل دے تو اس کے مذہبی پیشواؤں کی انجمن بن جانے کا خطرہ نہیں۔ ..... انسانی معاشرہ ایک غیر طبقاتی معاشرہ ہے۔ کیونکہ یہاں کوئی مذہبی انجمن اور طبقات خاص رعایات اور مفادات کے ساتھ نہیں ہیں۔ لیکن اصحاب علم اور اہل دانش میں سے ارکان مجلس کے انتخاب کا کوئی طریقہ ہونا چاہیے۔ سیاسیات میں مال و دولت کو کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے ورنہ وہ برائے نام جمہوریت اور عملی طور پر اہل ثروت کی ریاست ہوگی۔ (۱۲) مگر وقت کی ستم ظریفی ہے کہ اس اسلامی فلاحی جمہوریت کا زوال بہت جلد شروع ہو گیا۔ خلیفہ صاحب لکھتے ہیں کہ "دنیا نے اس حد تک ترقی نہیں کی تھی کہ وہ (فلاحی جمہوریت کے لیے) سازگار حالات پیدا کرسکے' اس لیے اس نصب العین کو معرض التوا میں رکھنا پڑا جب تک کہ تاریخ مختلف دوروں سے نہ گزرے جائے۔ بعض مسلمان ممالک اس موقف میں ہیں کہ وہ اس کو بروئے کار لاسکیں۔ کیا وہ اسلامی نمونے پر سلطنت بنا سکتے ہیں یا وہ ایسا

کر سکیں گے بھی؟ مستقبل بطن ایام میں ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیا وجود میں لائے گا۔ مگر اسلام نے تھوڑے عرصے کے لیے اس نمونے کو پیش کر دیا۔ (۱۳)

حقیقت یہ ہے کہ مدنی ریاست کے تمام پہلوؤں کا مکمل اور مفصل جائزہ لیا ہی نہیں گیا اس سلسلے میں جسٹس امیر علی' خلیفہ عبدالحکیم' علامہ اقبال اور ڈاکٹر علی شریعتی جیسے دو چار نام ہی ایسے ہیں جنھوں نے اس مثالی اسلامی ریاست پر تحقیقی کام کیا ہو۔

ریاست مدینہ کا زوال تو اس وقت ہی شروع ہو چکا تھا' جب حضرت عمرؓ کو شہید کر دیا گیا' کیونکہ انہوں نے مفتوحہ زمینوں کو عوامی ملکیت قرار دے دیا تھا' آنے والے برس میں وظائف میں امتیازی رویے کو ختم کر کے حضرت ابوبکرؓ کی طرح مساوات لانا چاہتے تھے اور غلامی کو مکمل طور پر ختم کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ بالآخر صفین و جمل کی خانہ جنگی اور حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد مدینہ کی خلافت دمشق میں منتقل ہوگئی' اور منہاج نبوت کی بجائے ملوکیت میں تبدیل ہوگئی۔ اس کے بعد اقتدار اور قانون سازی سے عوامی مفاد کی ترجیحات کو ختم کر دیا گیا۔ خزانہ خلیفہ کے ذاتی تصرف میں آگیا۔ قبائلی اور نسلی عصبیتیں دوبارہ جاگ اٹھیں' غلامی کا ادارہ دوام اختیار کر گیا' فلسفہ جبر رائج ہو گیا۔ حضرت ابو ذر غفاری کی تنقید کو خاموش کر دیا گیا' جسے خلیفہ صاحب نے مارکس سے ایک ہزار برس پہلے کی آواز قرار دیا ہے اور جاگیرداری نظام مکمل طور پر قائم کر دیا گیا' اگرچہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اسی پہلی فلاحی ریاست کو واپس لانے کی سعی کی' لیکن ایسا نہ ہوسکا' یہاں تک کہ بغداد میں اپنے پورے سج دھج کے ساتھ عریاں ملوکیت قائم ہوگئی۔ اسی ضمن میں اقبال نے خطبہ الہ آباد میں کہا تھا کہ "اس خطے کے حاصل ہو جانے سے اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی ملوکیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں' اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن' شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے قائم ہے اور اس سے نہ صرف ان

کے صحیح معانی کی تجدید ہوسکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔" (خطبہ الہ آباد' مطبوعہ حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی)

بغداد کی سلطنت کے اس دور کو جو ہارون رشید اور مامون پر مشتمل تھا' رابرٹ بریفالٹ نے مشرق کا دارالحکمت کہا ہے۔ مگر بہت جلد معتزلہ کی عقلیت پر اشاعرہ کی اذعانیت پسندی غالب آگئی۔ ڈاکٹر منظور احمد نے اپنے مقالہ "مستقبل میں اسلام کی تفہیم اور اکیسویں صدی میں ہمارا کردار" میں' جو اسی پلیٹ فارم پر پڑھا گیا تھا' حکم و اطاعت کے پیراڈائم کی تفصیل میں اشعریت کو مسلمانوں کے زوال کا باعث قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں جسٹس امیر علی نے لکھا ہے کہ:

"جب تک امام اشعری نے اپنا نیا مسلک ایجاد نہ کیا تھا اس وقت تک اقتدار کے لیے جو کشمکش تھی' وہ دو مسالک کے درمیان تھی یعنی عقلیت اور ملائیت کے درمیان۔ امام اشعری نے ملائیت کو ایسے حربے سے مسلح کر دیا جو اسے پہلے میسر نہ آیا تھا' جیسا کہ ان کے ممتاز شارح ابن عساکر نے کہا ہے کہ امام اشعری پہلے متکلم باللسان تھے جنھوں نے ارباب عقل اور دوسرے بدعت پسندوں کا مقابلہ خود ان کے منطقی اصولوں کے مطابق دلائل و براہین سے کیا۔" (روح اسلام' ۶۳۵)

دوسرے اقتباس میں خدا کے متعلق اشاعرہ کے تصور کو پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

"خدا اپنے بندوں پر ایک بادشاہ کی طرح حکومت کرتا ہے وہ جو چاہتا ہے کراتا اور جو حکم چاہتا ہے دیتا ہے۔ اگر وہ سارے بندوں کو دوزخ میں ڈال دے تو اس میں کوئی خطانہ ہوگی' اسی طرح اگر وہ سارے بندوں کو داخل جنت کر دے تو اس میں کوئی ناانصافی نہ ہوگی۔ کیونکہ ناانصافی ایسی چیزوں کے بارے میں حکم دینے کو کہتے ہیں جو حکم دینے والے کے قبضہ و اختیار میں نہیں ہیں یا چیزوں کے مقررہ علائق میں خلل پیدا کرنے کو کہتے ہیں۔ خدا حاکم مطلق ہے جس پر کوئی ناانصافی محمول نہیں ہوسکتی اور جس کی طرف کوئی غلطی منسوب نہیں کی جاسکتی۔ عقل کی

روسے کوئی چیز خدا پر واجب نہیں۔ نہ نافع عمل نہ مفید خلائق کام' نہ کریمانہ اعانت..... کسی کام کا بندوں پر فرض ہونا اسے خدا پر واجب نہیں بنا دیتا۔" (ایضاً ۶۳۳)

اشعریت کے اس تصور خدا نے مطلق العنان ملوکیت کی جڑوں کو مضبوط کر دیا اور اس کے وجود کے لیے دینی جواز مہیا کر دیا۔ علت و معلول کے رشتے کے انقطاع نے عقلی اور سائنسی تحقیق و تفکر کا خاتمہ کر دیا' تفسیر میں متن پرستی کو رواج دیا گیا۔ دین کے مسائل کے بارے میں کسی قسم کا سوال فقدان ایمان اور ناقابل معافی گناہ قرار دیا گیا اور تحقیق کو تو شیطانی کارروائی تصور کیا گیا۔ دوسرے لفظوں میں امام اشعری نے پیشوائیت کو وہ چیز عطا کر دی جس کی اسے مدتوں سے حاجت محسوس ہو رہی تھی' بالآخر اس مسلک نے مسلمانوں کی ترقی کو روک دیا اور صدیوں کے لیے ان کے قوائے عقلی کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔" (روح اسلام ۶۳۷) رہی سہی کسر تاتاریوں کی یلغار نے پوری کر دی۔ اس طرح مشرق کا یہ دارالحکمت ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

ادھر اندلس میں مسلم ریاستوں کی باہمی چپقلش اور عیسائیوں کی ریشہ دوانیوں سے اس عظیم الشان سائنسی اور عقلی تحقیق کا خاتمہ ہو گیا۔ ڈاکٹر رابنس نے اپنی ہسٹری آف میڈیسن میں' بریلفالٹ نے تشکیل انسانیت میں اور ڈاکٹر ڈریپر نے "معرکہ مذہب و سائنس" میں اندلس کے تمدن کے گن گائے ہیں۔ یہاں ڈاکٹر ڈریپر کی کتاب سے ایک اقتباس دیا جاتا ہے۔

> "یورپ کی تہذیب آج کے دن بھی اس سلیقہ' اس قرینہ اور اس لطافت مذاق سے معرا ہے' جو اندلسی عربوں کے پایہ تخت میں اپنی جھلک دکھاتی تھی۔ ان کے شہروں میں کوئی سڑک ایسی نظر نہ آتی تھی جس پر کنکر نہ کیے ہوئے ہوں اور جو رات کے وقت قندیلوں سے نہ جگمگاتی ہو۔ ان کے مکانات نقش و

نگار سے مزین اور قالینوں کے پر تکلف فرش سے آراستہ ہوتے تھے' جاڑوں میں انھیں دہکتے ہوئے تابدان گرم رکھتے تھے' اور گرمیوں میں معطر و معنبر ہوا جو پھولوں کی کیاریوں سے چل کر زمین دوز نلوں میں سے گزرتی ہوئی آتی تھی' انھیں خوشگوار ٹھنڈک پہنچاتی تھی۔ نفیس حمام' شاندار کتب خانے' کھانے کے فرحت افزا کمرے' پانی اور سیماب کے دلربا فوارے ان کے تمدن کی رونق دو بالا کرتے تھے۔ ہر شہر اور ہر قریہ میں دن عید اور رات شب برات تھی۔ بانسری اور چنگ کی تال پر جابجا محفل رقص و نشاط گرم نظر آتی تھی۔ اندلس کی دلفریب چاندنی راتوں کا لطف مسلمان امرا طرح طرح سے لیتے تھے' کوئی چمن میں بیٹھا داستان گویوں کے افسانوں سے جی بہلاتا تھا' کوئی باغ کی روشوں میں دوست احباب کے ساتھ ٹہلتے ہوئے فلسفیانہ مباحث میں اپنا وقت گزارتا تھا۔ (۱۹۹)

اندلس کا یہ عظیم الشان تمدن اپنے فلسفیوں کی تخلیقات اور طبیبوں اور سائنس دانوں کی تحقیقات یورپ کے حوالے کر کے خود موت کی نیند سو گیا۔ اب یورپ بیدار ہو چکا تھا۔ فرانسیس بیکن اور جان سٹوراٹ مل کی یونانی عقلیت پر شدید تنقید نے عقل استقرائی اور سائنسی تحقیق کا راستہ صاف کر دیا' مارٹن لوتھر اور کیلون کی سعی نے کیتھولک پاپائیت کو اس کے جمود اور عقائد پر تشدد کے باعث معاشرے کے عمل دخل سے باہر نکال دیا۔

مغرب نے جہاں زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں ترقی کی وہاں ریاست کو بھی جدید تصورات سے نوازا' چنانچہ ڈاکٹر یوسف حسین نے روح اقبال میں لکھا ہے کہ اس جدید ریاست کی خصوصیات ہیں۔ (۱) مذہب و اخلاق سے بے تعلقی (۲) اس کا ہمہ گیر ہونا اور (۳) وطنیت و قومیت کے تصور سے قوت حاصل کرنا۔ اقبال

نے جدید مغربی ریاست کی ان خصوصیات کو مسترد کر دیا۔ پہلی خصوصیت کا بانی میکیاولی تھا۔ اس نے مذہب و اخلاق کی اجتماعی حیثیت سے انکار کیا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ افراد نجی طور پر مذہب اور اخلاق کی پابندی کرسکتے ہیں' لیکن ریاست کو ان سے بالاتر ہونا چاہیے۔ مملکت کا فرض ہے کہ وہ اپنے بقا و استحکام کے لیے حصول اقتدار و قوت کے لیے کوشاں رہے چاہے وہ کسی طور پر بھی حاصل ہو۔ اقبال نے کہا کہ:

میری نگاہ میں ہے یہ سیاست لا دین
کنیز اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر
ہوئی ہے ترک کلیسا سے حاکمی آزاد
فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر

یہاں روسو' لاک اور ہوبز کے نظریوں سے' جو جدید ریاست کے معمار ہیں' بحث نہیں کی جاسکتی' کیونکہ میکیاولی کی تعلیمات پچھلی چار صدیوں سے جدید مغربی ریاست کی اساس بن چکی ہیں۔

دوسری خصوصیت کہ ریاست ہمہ گیر حیثیت رکھتی ہے' یہ اخلاقی پابندیوں سے آزادی کا نتیجہ تھا۔ دراصل جدید ریاست نے خدا کی جگہ لے لی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ فرد اس کی خاطر اپنے آپ کو مٹا دے اور اپنی تمام خواہشوں کو اس پر قربان کر دے۔ اس کا جینا مرنا اسی کے لیے ہو۔ اقبال نے اس کی شدید مخالفت کی۔ اس کے نزدیک وہ ایک انسانی ادارہ ہے جس میں شان الوہیت پیدا کرنا غلط ہے۔ ریاست محض اعتباری اور مجازی طور پر مقتدر ہے۔ مملکت کی ہمہ گیریت کو ہیگل کے کلیت پسند نظریے سے بہت تقویت ملی۔ حضرت ابوبکرؓ صدیق کے خطبے کے یہ الفاظ اسلامی ریاست کے کیریکٹر کو متعین کرتے ہیں:۔

"اے لوگو! میں تمھارا والی مقرر کیا گیا ہوں۔ میں تم سے

بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں بھلائی کروں تو میری مدد کرو۔ اگر میں برائی کروں تو مجھے تنبیہہ کرو۔ سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت۔ تم میں سے جو ضعیف ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے یہاں تک کہ اس کا حق دلوا دوں اور قوی ضعیف ہے یہاں تک کہ اس سے غریب کا حق لوں۔ میری اطاعت کرو اس وقت تک جب تک کہ میں اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کروں اور اگر میں اللہ اور رسولؐ کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت تم پر واجب نہیں ہے۔" (۱۴)

حضرت ابوبکر کے ان الفاظ نے ریاست میں الوہی خصوصیت پیدا کرنے کا انسداد کر دیا۔ جدید ریاست کی تیسری خصوصیت وطنیت و قومیت کے فلسفہ اجتماعی کو اساس قرار دینا ہے۔ اس نظریے نے ہم مذہب ہوتے ہوئے یورپ کی اقوام کو دو مہیب جنگوں میں مبتلا کر دیا۔ مورخ ٹائن بی نے اسے تنگ نظر قومیت قرار دیا ہے' اور مغربی تہذیب کے زوال کا ایک سبب بتایا ہے۔ اقبال نے اس تصور کو خلاف اسلام قرار دیا ہے اور اسے وطن دوستی کے جذبے سے دور رکھا ہے۔ اقبال نے کہا ہے کہ:

"ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں۔ کیونکہ ہم سب کرہ ارض کے اس حصے میں بود باش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے۔ علی ھذا القیاس چینی' عربی' ایرانی اور جاپانی وغیرہ۔ وطن کا لفظ جو اس قول میں مستعمل ہوا ہے محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا۔ اس کے حدود آج کچھ ہیں اور کل کچھ۔ کل تک اہل برما ہندوستانی تھے' آج بری ہیں۔ ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی

بساط کے اس کے لیے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے۔ بعض نادان لوگ اس کی تائید کرتے ہوئے "حب الوطن من الایمان" کا مقولہ حدیث سمجھ کر پیش کرتے ہیں' حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ مگر زمانہ حال کے سیاسی لٹریچر میں وطن کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ وطن ایک اصول ہے ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا' اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے' چونکہ اسلام بھی ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا ایک قانون ہے اس لیے جب وطن کو ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جائے تو اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔ (مقالات اقبال۔ ۲۲۳)

اسی طرح اقبال نے قومیت کے مغربی تصور اور اس کی توجیہ سے اختلاف کیا ہے اور بتایا ہے کہ ملت اسلامیہ ایک برادری ہے جسے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا تھا جس میں سب مسلمان شریک ہیں۔ اقبال نے کہا:

"میں سمجھتا ہوں کہ وطن پرستی کا خیال جو قومیت کے تصور سے پیدا ہوتا ہے' سراسر اصول اسلام کے خلاف ہے اس لیے کہ اسلام دنیا میں ہر طرح کے شرک جلی و خفی کا قلع قمع کرنے کے لیے نمودار ہوا تھا۔" (مقالات اقبال)

" Islam as a polity is only a practical means of making this principle (Tauhid) a Living factor in the intellectual and emotional life of mankind. It demands loyalty to God not to thrones. And since God is the ultimate spritual basis of all life loyalty to God virtually amounts to man's loyalty to his own ideal nature."

(The Reconstruction of Religious Thought in Islam P. 140)

لہٰذا اقبال نے جدید مغربی ریاست کی تینوں خصوصیات رد کرتے ہوئے اسلامی ریاست کی حقیقت یوں بیان کی ہے۔ (۱۵)

چنانچہ مسلمان اپنے زوال اور مغرب کی بیداری و ترقی کے بعد کہیں بھی اسلام کی اساس پر کوئی ریاست قائم نہ کرسکے۔ عربوں میں ملوکیت قائم رہی' ترکی نے بورژوا جمہوریت کو اپنا لیا۔ اور اسی تصور کی جنوبی ایشیا' جنوب مشرقی ایشیا' شمالی افریقہ اور وسط ایشیا کی مسلم ریاستیں پیروکار بن گئیں۔

جدید مغربی ریاست جس کی اساس جارحانہ وطن و قومیت کے بعد محنت کے استحصال اور اکتناز زر پر قائم تھی اس کے متعلق خلیفہ صاحب نے کہا ہے کہ:

> "مملکت' جس کو مراعات یافتہ جماعتیں بطور دھوکے کے استعمال کرتی تھیں' اس کی پرستش کی تائید ہر قسم کے نظریات اور تصورات سے کی گئی۔ ہیگل نے مملکت کو بڑھا چڑھا کر ذات مطلق کا اعلیٰ ظہور بتلایا۔ نٹشے نے جرمن قوم کے خدائی منصب کی تبلیغ کی۔ نطشے نے اقتدار اور طاقت کو بنیادی قدر بتلایا۔ ڈارونی ارتقائیت کو تنازع للبقا اور بقاے اصلح کے لیے بطور عقلی تائید کے ایک سہل نسخہ ہاتھ آیا۔ افراد اور مملکت کے درمیان بے رحم و بے اصول مسابقت کا پرچار نہ صرف بے بصر میکانکی فطرت کے قانون کی حیثیت سے اختیار کیا گیا' بلکہ اس کو انسانیت کی اصلاح کے لیے خدائی منصوبے کے اصول کی طرح سمجھا گیا۔ کمزور سے فائدہ اٹھانا جائز بن گیا۔ مملکتوں کی طاقت ہی وہ چیز تھی جو تمام حقوق بیدار کرتی تھی۔"
>
> (۱۶)

مسلم ریاستوں کی زوال پذیری کے متعلق خلیفہ صاحب نے کہا کہ:

"اقتدار کے اس شور و ہنگامے میں مسلمان ریاستیں دب کر رہ گئیں۔ قومیت اور سرمایہ داری کا وجود مسلم سوسائٹی میں کبھی نہ تھا اور جو زبردست خلاف عقل محرکات ان کی بدولت انسانیت پر پھوٹ پڑے تھے' وہ اسلام کے مزاج کے بالکل ناموافق تھے۔ مسلم مملکتوں میں مطلق العنان بادشاہت پوری طرح روبہ زوال ہو چکی تھی' یہ غیر اسلامی ریاستیں تھیں جو نہ تو اپنے آپ کو اسلامی نمونے پر ڈھال سکتی تھیں اور نہ عملی سائنس اور صنعتی نظام کے ذریعے فائدہ اٹھا سکتی تھیں۔ یہ صرف ظاہری شکل اور زبانی دعوے میں مذہبی حکومتیں تھیں' مگر فی الحقیقت جابرانہ اور غیر اسلامی تھیں۔ یہ نہ اسلامی مفہوم میں دینی حکومتیں تھیں اور نہ دنیوی مفہوم میں اقتدار پرست مملکتیں تھیں' انھیں دونوں جہانوں میں خسران نصیب ہوا۔" (۱۷)

لہٰذا یورپ کے صنعتی انقلاب کے بعد مسلم اقوام اپنے فکری جمود' معاشی اور سیاسی ابتری اور اپنی تہذیبی پسماندگی کے باعث یکے بعد دیگرے یورپی اقوام کی غلامی میں آتی چلی گئیں۔ یہ عہد جو سقوط اندلس سے شروع ہوا تھا' مسلمانوں کے لیے بڑا روح فرسا اور تاریک تر تھا۔ غلامی کے اس عہد میں مسلم اقوام مغرب کے اس نئے فکر سے روشناس ہوئیں' جس کی اساس استقرائی منہاج تحقیق پر قائم ہوئی تھی' یہ منہاج تحقیق اگرچہ مسلم دانش کے لیے نیا نہیں تھا مگر صدیوں سے اسے نظر انداز کر دیا گیا تھا اور یونان کی غیر تجربی اور قیاسی عقلیت پر انحصار کر لیا گیا تھا۔

مسلم اقوام کی نئی نسلوں کے اذہان اس نئے اور ترقی پسند فکری ماحول میں پروان چڑھے جس نے فطرت کے تمام علاقوں یعنی زمین' سمندر اور فضا کے کونے کونے کو چھان مارا تھا۔ اس جدید اور تازہ فکر سے مسلح ہونے والے مسلم ذہنوں

نے اپنی تاریخ کے ماضی اور حال کا مطالعہ کیا' اپنی غلامی کے اسباب پر غور کیا اور اس سے نجات پانے کے طریقوں کو معلوم کرنے کی کوشش کی' یہاں تک کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد تمام مسلم ممالک نے زود یا بدیر مغربی غلامی سے نجات حاصل کر لی۔ اسی عہد میں اشتراکی انقلاب نے عالمی طاقت کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ آزادی کے بعد ان مسلم ممالک کو اپنی تعمیر نو کا مسئلہ درپیش تھا اور ان مسائل کو حل کرنے کی ضرورت تھی جو اس وقت درپیش تھے۔ ان مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے خلیفہ صاحب نے کہا ہے کہ:

"حکومت کو زمیندار اور لگان دار کے تعلق اور مختلف نوعیت کے حق ملکیت زمین کے جواز و عدم جواز کی بابت تصفیہ کرنا ہے۔ حکومت کو سرمایہ اور محنت کی بابت بھی فیصلہ صادر کرنا ہے۔ حکومت کو اپنے مالی نظام اور بینک کاری کی بابت بھی طے کرنا ہے جس کو راسخ الاعتقاد کافرانہ سمجھتے ہیں' کیونکہ اسلام میں سود کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ یہ مسئلہ تصفیہ طلب ہے کہ آیا بینک کا سود اور کاروبار کا سود' دونوں مثل ربا کے ایک ہی ہیں' جس کی اسلام نے ممانعت کی ہے۔ موجودہ نظام زندگی میں عورت کے مرتبے کا تعین کرنا ہے۔ ایک مسلمان مملکت میں غیر مسلموں کے حقوق کی واضح طور پر تعیین کرنا ضروری ہے اور ایک جمہوری ریاست میں ان تمام امتناعات (تضادات) کو رفع کرنا لازم ہے جس کی بنا کسی جنس و عقیدے پر ہو۔" (۱۸)

ان مسائل کو حل کرنے کے لیے مسلم دانشوروں کی نظریں اسلام کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ ان مسائل کا حل کس اسلام کے پاس ہے؟ قدیم دینی مدرسے کے اسلام یا ابتدائی اصلی اسلام کے پاس ہے۔ اسلام کی وہ

تعبیر جسے دینی مدرسوں نے تیار کیا تھا' اس تعبیر میں عصر حاضر کے صنعتی انقلاب سے پیدا ہونے والے اہم مسائل سے پہلو تہی کی گئی تھی' اور اسلام کی اس تعبیر پر زور دیا گیا تھا جو مسلم بادشاہوں' اشرافیہ اور جاگیرداروں کے مفادات کو تحفظ فراہم کرتی تھی' اور بدقسمتی سے یہی تعبیر آج بھی دینی مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ خلیفہ صاحب نے اسی مدرسی اسلام کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ:

> "آنحضرتؐ نے یہ پیش گوئی فرمائی تھی کہ ایک زمانہ آئے گا جب مسلمانوں میں بھی غیر استدلالی انداز فکر ترقی پا جائے گا' جیسا کہ ظہور اسلام کے وقت یہودیوں اور عیسائیوں میں موجود تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمان بھی نجات کی اجارہ داری کے دعویدار بن جائیں گے اور اپنی اخلاقی اور روحانی حیثیت کا لحاظ کیے بغر خود کو "چیتی قوم" سمجھنے لگیں گے۔ یہ فریسی نقطہ خیال کی مدح و ثنا کریں گے' زیادہ زور ظاہری پابندیوں پر دیں گے اور لفظ و صورت کو روح و معنی پر ترجیح دیں گے۔ پوست کی حفاظت میں مغز کو برباد کر دیں گے۔ تمام روشن خیال مسلمان محسوس کرتے ہیں کہ واقعتاً" یہ چیز رونما ہو چکی ہے اور مسلمان اس وقت اپنے خاص رنگ کی فریسیت کے زیر سایہ' زندگی گزار رہے ہیں۔ (۱۹)

اس (ملائیت) نے اسلام کی ترقی پذیر روح کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ اس وقت "ملا" ابدی صداقتوں کا حامل اور نگہبان ہونے کا دعویدار ہے' وہ ہر اہم مسئلے کا' کسی قدیم ماخذ کی بنیاد پر ایک تیار حل رکھتا ہے۔ کوئی نیا مفکر و مصلح معتبر نہیں ہوتا کیونکہ آزاد خیالی تمام تقلید پرستوں کے نزدیک مردود قرار دی گئی ہے۔ سیاسی اقتدار اعلیٰ کے معاملے میں یہ بادشاہت کو جمہوریت پر ترجیح دیتے ہیں اور ایک فاسق و فاجر اور لایعقل بادشاہ کو ظل اللہ کا خطاب دیتے ہیں جو حقوق ربانی کی بنا پر

حکمرانی کرتا ہے۔ یہ حق ملکیت زمین کی اصلاح یا امداد باہمی کے اصول پر زرعی ترقی کی طرف ایک قدم بھی بڑھانا نہیں چاہتے۔ یہ بڑی زمینداریوں کی تائید میں نیک نیت اور پرجوش حامیوں کی طرح کمربستہ رہتے ہیں۔ یہ غلاموں کو آزادی دلانے اور اس غیر انسانی ادارہ کو برخاست کرنے کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ اسلامی تعلیم عورت و مرد کے حقوق میں مساوات قائم کرنے کے لیے ہے' مگر مولوی اسی امر کی تبلیغ کرتے ہیں کہ عورت پر مرد کی حکومت قائم ہو' نکاح و طلاق کی بابت اسلام کے معقول قوانین' مرد کے مفاد کی خاطر مسخ کر دیے گئے ہیں۔ اور یہ نہایت جسارت کے ساتھ اس امر کا اعادہ کرتے ہیں کہ تمام ترقی پذیر' آزاد اور مطابقت پذیر قانون سازی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ ایک ہزار سال کے فقہا' خدا اور اس کے رسول سے زیادہ قابل اعتبار اور مستند بن گئے ہیں۔ اس رجعت پسند تقلید پرستی کے اثر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام جامد اور ترقیوں کا مخالف ہو گیا ہے۔"
(۴۵۵-۴۵۷)

لہٰذا یہ بات یقینی ہے کہ ملوکیت کے تقاضوں کی فضا میں مرتب ہونے والے اسلام کا نیا نسخہ عصر جدید کے مسائل کا کوئی حل اپنے دامن میں نہیں رکھتا ہے۔ خلیفہ صاحب فرماتے ہیں کہ:

> "عالم اسلامی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سیاسی اضطراب و ہیجان کے ساتھ ساتھ تہذیبی کشمکش بھی برسرکار ہے۔ ہر جگہ کاملا" احساس و عمل' عروج و ترقی' احیاو تجدید کا تقاضا موجود ہے۔ احیائے مذہب کی تحریکات مختلف نوعیت کی ہیں۔ تاہم ایک چیز ان میں مشترک ہے' وہ یہ اعتقاد ہے کہ روحانی فیضان و مثال کے لیے انھیں اسلام کی اولین تحریک کی طرف رجوع ہونا چاہیے۔ اسلام کی اصلی خوبی کو مابعد کے تمام حشو زوائد اور گمراہیوں سے بے اعتنا ہو کر

جنھوں نے اس کے اصل چہرے پر غیر اسلامی تصورات و رسومات کے پردے ڈال دیے ہیں۔ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"
(۲۰)

چنانچہ اس سلسلے میں عالم اسلام میں کئی ایک تجدد پسند تحریکوں نے جنم لیا جن میں احادیث کا انکار کر کے محض قرآن کو اپنانے والی' احادیث کو قرآن کے برابر درجہ دینے والی' قرآن کے شرعی قوانین کو قابل تبدل تسلیم کرنے والی یا فقہی جمود کی حامی تحریکیں شامل ہیں۔ لمحہ فکریہ یہ ہے کہ مذکورہ مسائل کو حل کرنے کے لیے کس تحریک کو اپنایا جائے۔ خلیفہ صاحب فرماتے ہیں کہ:

"کیا اسلام ایک فرسودہ مذہب ہے اور بطور ایک مانع ترقی مذہب کے اس کو ترک کر دینا چاہیے؟ یا ہمیں انسانیت کی مادی اور ذہنی ترقی کی روشنی میں اس کی جدید تفسیر کرنی چاہیے؟ کیا مسلمانوں کو ہر اعتبار سے مغرب کی ترقی پسندی قوموں کی محض تقلید کرنی چاہیے' یا نہیں تخلیقی امتزاج (Creative Synathesis) (یعنی اجتہاد) کے ذریعہ کچھ نہ کچھ خدمت سرانجام دینی چاہیے۔"

اسلام کی اصل قوت ان تصورات کی دلیرانہ امتزاج کی رہین منت ہے' جن کو مختلف قوموں کے غیر معمولی ذہن و دماغ سے قبل الگ الگ نشوونما دیتے رہے۔" (۲۱)

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ:

"اصطلاحات کے جدید مفہوم کے لحاظ سے اصلی اسلام نہ کلیسیائی ہے اور نہ لادینی (سیکولر) مغرب میں سیکولرازم یا لادینیت' چرچ اور مذہبی پیشوائیت کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ اسلام نے ان دونوں اداروں کو برخاست کر دیا۔"

(۲۲)

ملت بیضا کی احیاء و تجدید اور انسانوں کی از سرنو قیادت کے لیے اسلام کی حقیقی روح کو دوبارہ زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کے لیے "خذما صفا" کے اصول پر کاربند ہو کر ان اچھی چیزوں کو لیتے ہوئے آگے بڑھنا چاہیے جو غیروں کے ساتھ نشوونما پاتی ہیں۔ اسلام میں کوئی نسلی یا جغرفیائی قومیت نہیں ہے۔ "وللہ المشرق والمغرب" (بقرہ ۱۷۶) کوئی چاہے تو اس میں یہ اضافہ کرسکتا ہے کہ اللہ ماضی حال اور استقبال کا ہے۔ کیونکہ اللہ ہی زندگی کے دائمی اقدار کا مقصود اعلیٰ ہے۔ مسلم تمدن نے اپنے دور میں گذشتہ تہذیبوں کے بہترین عناصر کو اپنے میں سمو لیا۔ ہندوؤں کی رومانیت' عبرانیوں کی اخلاقی خدا پرستی' جس کا کامل ظہور حضرت مسیح کی شخصیت میں ہوا' اور جسے قرآن روح اللہ سے تعبیر کرتا ہے' اور رومن سلطنت کی قانونی ذہانت کو اپنا لیا۔ قرآن نے نسل انسانی کی یگانگت اور خدا کی وحدانیت کے ساتھ وحدت ادیان پر زور دیا..... قدیم اصطلاح میں مذہب' تمدن و تہذیب کے تمام دائرہ عمل پر حاوی تھا۔ اس لیے قرآن جب وحدت ادیان پر زور دیتا ہے اور اس کو ایمان و یقین کا مرکزی اصول قرار دیتا ہے تو اس کا مطلب تمام انسانی تہذیبوں کی اساسی وحدت ہوتا ہے۔ اسلام نے اس امر کی تعلیم دی ہے کہ روحانیت اور نجات کسی گروہ یا جماعت کی اجارہ داری نہیں ہے جو بلا شرکت غیرے اپنے لیے اس کی دعویدار ہو..... (۴۳۳) مزید لکھتے ہیں:

> "تاریخ انسانیت میں مختلف قومیں' مختلف زمانوں میں' اپنی گوناگوں خدمات سے انسانی تہذیب و شائستگی کے سرمایہ میں اضافہ کرتی رہیں' لیکن اعلیٰ ترین تہذیبیں ترک و انقطاع سے نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ اخذ و اختیار کے ذریعے پروان چڑھیں اور ترقی پذیر حیات کی کیمیا گری سے ان کی ماہیت تبدیل ہوتی رہی۔ "خذما صفا و دع ماکدر" ایک عام اسلامی

اصول ہے۔ (۲۳)

پھر لکھا کہ:

"جب ہم اسلام کی ابتدائی چھ صدیوں کی تہذیبی لطافتوں کا جائزہ لیتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مسلمانوں کی غیر معمولی ذہانت نے تمام تہذیبوں کے بہترین عناصر کو بہم آمیز کیا اور اس امتزاج کو ایک تخلیقی صورت عطا کی۔ صدیوں کی غفلت و جمود کے بعد اب مسلمانوں کو اس تخلیقی جذب و انجذاب کی روح کو دوبارہ تسخیر کرنا ہے۔" (۲۴)

اب صورت حال یہ ہے کہ اکیسویں صدی سر پر آگئی ہے اور مسلمان دوراہے پر کھڑا ہے' ایک طرف اس کے سامنے مدینہ منورہ کی مثالی اسلامی ریاست ہے۔ دوسری طرف مغرب کی بے پناہ ترقی اور جدیدیت کا دیو کھڑا ہے۔ اکیسویں صدی تک پہنچتے ہوئے انسانی ذہن کی کدو کاوش کے سبب ذرائع پیداوار' ذرائع مواصلات و حمل و نقل' اشاعت علم اور ابلاغ کے ذرائع نے بے حد ترقی کر لی ہے۔ وقت اور فاصلہ سمٹ کر انسان کی دسترس میں آگئے ہیں۔ ان علمی اور معاشرتی ارتقا کی بدولت دنیا ایک عالمی بستی (Global Village) بن چکی ہے۔ امید ہے کہ اگر کوئی رکاوٹ راستہ میں نہ آئی تو اس "آفاقی بستی" کا تصور اکیسویں صدی کے وسط تک ایک زندہ و توانا حقیقت بن جائے گا۔ اور سرمایہ دارانہ جمہوریت' کمزور اقوام پر معاشی اور فوجی غلبہ حاصل کرنے والا سامراجی عمل اور دہریت پسند سوشلزم کے لیے اس میں کوئی جگہ نہ ہوگی۔

برناڈ شا نے کہا تھا کہ مستقبل کا مذہب اسلام ہوگا۔ مگر اس اسلام کے لیے مسلم دانش مندوں کو آفاقی پیغام کو پوری وضاحت کے ساتھ سامنے لانا ہوگا۔ اس کے لیے سامی النسل انبیا کے ساتھ' جن کا ذکر قرآن حکیم میں آیا ہے مگر ان کا بھی جن کا ذکر نہیں کیا گیا یعنی آریائی اور زرد اقوام کے حکما اور روحانی شخصیتوں

اور ان کی تعلیمات کو تسلیم کرنا ہوگا۔ مفسرین کی اکثریت نے حضرت لقمان کو نبی تسلیم نہیں کیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر وہ تعلیم جو توحید الٰہی' حیات اخروی' عدل اجتماعی اور تزکیہ ضبط و نفس پر مبنی ہوگی یہ چاہے کسی نبی کی طرف سے دی جائے یا کسی غیر نبی کی زبانی دی جائے' مسلمان اسے تسلیم کرنے کے لیے مجبور ہیں۔ اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حکمت مومن کا گم شدہ مال ہے جہاں سے ملے اسے حاصل کرے۔" فنون لطیفہ کو حرام قرار دینے کی بجائے حیات انسانی کے اعلیٰ مقاصد اور اخلاق کو فطرت انسانی میں راسخ کرنے کے لیے ان سے کام لینا ہوگا۔ عورت کو مرد کی انا کے تسلط سے آزاد کرنا ہوگا۔ اور اس پر تعلیم کے حصول اور معاشی و سماجی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے تمام رکاوٹوں کو دور کرنا ہوگا۔ اس مفروضہ کو خیرباد کہنا ہوگا کہ مرد عورت کی عزت کا محافظ ہے سوسائٹی میں اس شعور کو اجاگر کرنا ہوگا کہ عورت خود اپنی عزت و عصمت کی محافظ ہے کیونکہ قرآن حکیم کی رو سے عورت کو خدا نے مرد کی پسلی سے نہیں پیدا کیا بلکہ مرد سے الگ ایک آزاد اور خود مختار وجود کی حیثیت سے تخلیق کیا ہے۔ کیونکہ یہ مفروضہ بہت حد تک عورت کی غلامی کا باعث بنا ہے۔ لفظ "قوام" کے معنی جاگیرداری پس منظر میں تو حاکم کیے جاسکتے ہیں مگر جدید عہد میں صرف سربراہ کیے جاسکتے ہیں' وہ بھی جسمانی لحاظ سے' جب کہ معاشی لحاظ سے عورت خود کفیل ہو رہی ہے۔ جب شرط نہیں رہے گی تو جزا کیسی۔ ایران کے شہید دانشور ڈاکٹر علی شریعتی نے قصہ آدم پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ "قرآن حکیم کی رو سے یہ سمجھنا ہوگا کہ وحی الٰہی کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب انسان آقا اور غلام کے طبقات میں تقسیم ہوگئے' ایک دوسرے کے دشمن بن گئے اور اس طرح طبقاتی کشمکش شروع ہوگئی' جس سے جنتی معاشرے کے خاتمے کے بعد ارضی معاشرہ خوف یعنی جنگ' فساد' لوٹ مار' چوری اور ڈاکہ زنی اور جنسی آوارگی میں مبتلا ہوگیا' دوسری طرف ذرائع پیداوار کی محرومی سے حزن یعنی بھوک' افلاس' محرومی و محکومی' جہالت اور جبری

عصمت فروشی کی حالت میں پھنس گیا۔ قرآن نے کہا ہے کہ ذرائع پیداوار پر اگر دوبارہ اجتماعی ملکیت قائم ہو جائے تو "خوف و حزن" سے نجات حاصل کرسکتے ہو۔ خلیفہ صاحب نے کیمونزم اور اسلام میں ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں۔

After all the wealth and comforts of the rich are the products of the labours of the poor. (۱۹۱)

تاریخ بتاتی ہے کہ معاشرہ پہلے آقا اور غلام میں تقسیم ہوا' پھر ارتقا کرتے ہوئے جاگیردار اور زرعی غلام اور مشین کی ایجاد کے بعد کارخانہ دار اور اجرتی غلام (مزدور) کے طبقات میں تقسیم ہو گیا اور آج تک تقسیم ہے۔ وحدت انسانیت اور خلافت آدم کے قیام کے لیے جہاں ان معاشی طبقات کو ختم کرنے کا حکم دیا (سورہ حشر آیت ۷) وہاں مسلمانوں کو وحدت ادیان کی اصل عظیم کو بھی تسلیم کرنا ہوگا اور اس سلسلہ میں سابقہ آسمانی کتابوں کو منسوخ تصور کرنے کی بجائے قرآن حکیم اور کتب مقدسہ کا یک ساتھ مطالعہ کرنا ہوگا تاکہ اسلام ایک مخصوص ملت کا مذہب تصور ہونے کی بجائے ساری انسانیت کا مذہب قرار پاسکے۔ سرسید مرحوم نے "التبیین فی کلام الرحمان" لکھ کر ایک مثبت قدم اٹھایا تھا۔ مگر اس پر مسلم دانش' نے کوئی کام نہیں کیا۔ ترکی کی دانشور خاتون خالدہ ادیب نے ایک اجلاس کے منظر کو دیکھ کر جس میں مختلف مذاہب کے لوگ اکٹھے کھا پی رہے تھے اور آپس میں محو گفتگو تھے' لکھا ہے کہ ایک دن آئے گا جب یہ لوگ اکٹھے مل کر عبادت بھی کریں گے۔

اکیسویں صدی میں اسلام کو ایک عالمگیر اور علم اور انسان دوست مذہب کی حیثیت سے لے جانا ہے تو قرآن حکیم کی تعلیم کے مطابق اسے مطالعہ کائنات کو اپنا مذہبی فریضہ بنانا ہوگا اور اس سلسلہ میں سائنسی تحقیق اور اس سے ابھرنے والے فکر پر کسی قسم کی مذہبی قدغن نہیں لگانی ہوگی اور تفکر' تدبر' تعقل کی قرآنی

اقدار کو زندگی کے ہر معاملہ میں پوری فکری آزادی کے ساتھ اپنانا ہوگا۔ مسلم دانش ور کو سمجھ لینا چاہیے کہ اندلس میں جیسے جیسے علم و دانش پر مذہبی پیشواؤں کی قدغن عائد ہوتی گئی' مسلم معاشرہ تباہی کی طرف تیزی سے بڑھتا چلا گیا۔ اسی ضرورت کے لیے اجتہاد مطلق کا دراز بھی کھولنا ہوگا' اقبال نے کہا ہے ہر نئی نسل اپنے مسائل کو خود حل کرے۔

اقبال نے مستقبل کی جدید ریاست کا نقشہ کھینچتے ہوئے بتایا ہے کہ عہد حاضر میں انسان کو اپنی نجات کے لیے تین چیزوں کی ضرورت ہے' کائنات کی روحانی' تعبیر' انسان کا روحانی استخلاص' اساسیات جن کی نوعیت عالمگیر ہو اور جاوید نامہ میں محکمات عالم قرآنی کے زیر عنوان چار محکمات یا اساسیات کا ذکر کیا ہے' یعنی خلافت آدم' الارض للہ' حکومت الہیہ' حکمت خیرکثیر (Wisdom) ہے' یہ چھ باتیں اقبال کا نیو ورڈ آرڈر ہیں۔ اور اس کے ساتھ فلک مریخ کے مرغدینی معاشرہ پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ مکمل فلاحی روحانی معاشرہ ہے۔

ختم نبوت کا مفہوم یہ تھا کہ جو کام انبیا کرتے تھے' وہی اب ملت اسلامیہ کو کرنا ہوگا یعنی مراعات یافتہ طبقہ کی جگہ محنت کش' پسماندہ اور محروم طبقوں کی معاشی اور تہذیبی حالت کو درست کر کے انہیں ترقی اور اقتدار کے حصول کے راستہ پر ڈالنا (سورۂ قصص آیت ۵) محکوم اور پسماندہ اقوام کی سیاسی اور معاشی آزادی کی جدوجہد میں مدد کرنا (مؤلفۃ القلوب) انسانوں کو جہالت' افلاس اور توہمات سے نجات دلا کر انہیں علم اور خوشحالی کی نعمتوں سے سرفراز کرنا تھا تاکہ وہ اپنی تخلیق کی غایت کو سمجھ سکیں اور جبلتوں کے حیوانی تقاضوں پر ضبط نفس سے قابو پا سکیں۔ اور یہی حقیقی مذہب ہے کہ دراصل یہی وہ تصوف یا درونیت ہے جو ہر مذہب کی روح اور مغز ہے جس کے بغیر تمام رسوم و ظواہر بے نتیجہ ہیں۔

Religion which in its higher manifestations is neither dogma nor priesthood nor ritual .....

It is only by rising to a fresh vision of his origin and Future. (۲۶)

مگر افسوس ہے کہ ہماری مذہبی دانش نے ان تمام فرائض کو دنیوی قرار دے کر نظر انداز کر دیا۔ اکیسویں صدی میں جانے کے لیے مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے، خلیفہ صاحب فرماتے ہیں:

"ابھی مسلمانوں کو جمود اور بے حسی پر غلبہ پانا ہے۔ بہت کچھ علوم و فنون حاصل کرنا ہے اور مغربی سامراجیت کی باقی ماندہ یادگاروں سے سیاسی آزادی کی لڑائیاں لڑنی ہیں' صدیوں کے جمود کو توڑنے کے لیے متعدد داخلی ہنگاموں کی ضرورت ہے۔ خود اسلام کے مفاد کی خاطر انہیں اپنی تقلید پسندی کو تمام غیر اسلامی اضافوں سے پاک کرنا ہے۔ روایتی اقدار اور ابدی صداقتوں کو بہت سی ایسی ریاکاریوں اور نقالیوں سے پاک صاف کرنا ہے جنہوں نے مذہب کا روپ اختیار کر لیا ہے' اسلام کو اب بھی ایک خدا کی پرستش کی اساس پر انسان کو متحد کرنے کا فرض انجام دینا ہے۔ عالم اسلامی ملحدانہ اور شدید مادہ پرست قوتوں کے خلاف ایک بہترین پناہ بن سکتا۔ ایک عالمگیر مسلم برادری کی بنا ڈالنے کے علاوہ قرآن نے تمام خدا پرستوں کی ایک وسیع برادری کی تشکیل پر بھی غور کیا ہے۔ اسلام کے ایک زبردست فلسفی اور مبصر اقبال نے اپنے خطبات ہی میں کہا ہے کہ "عہد حاضر کے مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنی حیثیت کا بخوبی اندازہ کرے۔ اساسی اصول کی روشنی میں اپنی معاشرتی زندگی کی اصلاح کرے اور اسلام کے اس وقت تک منکشف شدہ مقاصد سے یہ استنباط کرے کہ روحانی جمہوریت کا قیام

اسلام کا آخری نصب العین ہے۔(۲۷)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مسلمان نوجوان نسل کو جہاں عہد حاضر کے مسلم دانشوروں کے افکار سے آگاہی حاصل کرنا از بس ضروری ہے' مثلاً علامہ اقبال' ڈاکٹر فضل الرحمان' ڈاکٹر علی شریعتی' مالک بن نبی اور دوسرے اہل علم اس کے ساتھ ساتھ مغرب کے اہل فکر کی تخلیقات سے بھی آگاہ ہونا نہایت ضروری ہے' کیوں کہ روح عصر سے آگاہ ہوئے بغیر مسلمان انسانی معاشرے کی کوئی خدمت نہیں کرسکتے۔ مزید یہ کہ اسلامی ورثے اور مغربی فکر سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ نوجوان نسل کا فرض ہے کہ وہ قرآن مجید اور رسول کریمؐ کی زندگی کا خود گہری نظر سے مطالعہ کریں' توہمات' تعصبات اور غیر صحت مند روایات سے ہٹ کر' یہی ایک راہ ہے جس پر چل کر مسلمان اپنے آپ سے آگاہ ہو کر اکیسویں صدی میں کوئی مثبت کردار ادا کرسکتے ہیں۔ اپنے معاشروں کو مضبوط اخلاقی' سیاسی اور معاشی بنیادوں پر استوار کیے بغیر نعرے تو لگائے جاسکتے ہیں' بلند بانگ دعوے بھی کیے جاسکتے ہیں' لیکن فکر و نظر' سیاست و معیشت اور اخلاق و قانون کی دنیا میں کوئی مثبت خدمت انجام نہیں دی جاسکتی۔ چنانچہ وقت آگیا ہے کہ ہم روحانی بنیادوں پر ایک فلاحی' جمہوری ریاست قائم کریں' جس میں ملک کے تمام شہریوں کا وقار' نسل' زبان' عزت' جان اور عقیدہ محفوظ ہو اور وہ ایک باوقار پرامن اور خوش حال زندگی بسر کرسکیں' اقبال نے اسی آسمانی ریاست کا خواب دیکھا تھا اور اسی خواب کو حقیقت بنانے کے لیے محمد علی جناحؒ نے اپنی ساری توانائیاں صرف کی تھیں۔ آیئے ہم ایک نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ اس روحانی' فلاحی اور جمہوری ریاست کے استحکام کے لیے کام کریں' اکیسویں صدی کا یہی تقاضا ہے۔

حواشی

۱۔ اسلام کا نظریہ حیات، از خلیفہ عبدالحکیم، ص ۲۹۴، ناشر ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ لاہور

۲۔ ایضاً، ص ۲۹۷

۳۔ ایضاً، ص ۳۰۸

۴۔ Inquiry London, May ۱۹۸۶ء

۵۔ اسلام کا نظریہ حیات، ص ۲۸۷۔۲۸۸

۶۔ ایضاً، ص ۲۸۹

۷۔ ایضاً، ص ۲۹۰۔۲۹۱

۸۔ ایضاً، ص ۳۱۱

۹۔ ایضاً، ص ۲۹۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۹۲

۱۱۔ اسلام اینڈ کیمونزم (انگریزی)، از خلیفہ عبدالحکیم، ناشر ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ ص ۱۹۱

۱۲۔ اسلام کا نظریہ حیات، ص ۳۳۴

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۳۷۔

۱۴۔ بحوالہ روح اقبال، از ڈاکٹر یوسف حسین، ادارہ اشاعت اردو، حیدر آباد، ص ۱۹۶۔

۱۵۔ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ (انگریزی ایڈیشن) ص ۱۴۰
۱۶۔ اسلام کا نظریہ حیات، ص ۳۴۶۔
۱۷۔ ایضاً، ص ۳۴۷
۱۸۔ ایضاً، ص ۴۲۹
۱۹۔ ایضاً، ص ۴۵۵
۲۰۔ ایضاً، ص ۴۲۵
۲۱۔ ایضاً، ص ۴۳۰
۲۲۔ ایضاً، ص ۴۳۱
۲۳۔ ایضاً، ص ۴۳۴
۲۴۔ ایضاً، ص ۴۳۵
۲۵۔ اسلام اینڈ کیمونزم، ص ۱۱۲
۲۶۔ تشکیل جدید الہیات اسلامی، (انگریزی ایڈیشن)، ص ۱۸۹
۲۷۔ اسلام کا نظریہ حیات، ص ۴۶۲

○ ○ ○